رخسانہ صبا☆

امام بخش صہبائی: حیات، آثار اور ممات

Imam Bakhsh Sehbai: his life, works and death
By *Dr Rukhsana Saba, Assistant Editor, Qaumi Zaban, Amjuman Taraqqi-e-Urdu Pakistan, Karachi.*

Imam Bakhsh Sehbai was a scholar, poet and researcher and was mercilessly killed by the British during the 1857 war of freedom. Sehbai was a renowned scholar and was respected for his work. Not much has been written about his life, works and his death, though some of his works were acknowledged as remarkable and are still valued. This article gives his biographical details as well as the details about his works. Sehbai's death was tragic and different accounts of his death are found in different books and there have been some inaccuracies too. This article has also removed some of the incorrect accounts regarding Sehbai. With references and endnotes, this article increases our understanding of Sehbai.

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے　　گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک　　تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا(۱)

غالب کے یہ اشعار پڑھتے ہی دلی کا وہ خونیں منظر نامہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد اس کا مقدر بن گیا تھا۔ یوں تو دہلی تباہی و بربادی کے کئی مراحل سے ماضی میں اور خصوصاً نادر شاہی حملے (مارچ ۱۷۳۹ء) کے وقت گزر چکی تھی لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد دہلی جیسے تہذیبی مرکز کی تباہی تاریخِ ہند کا وہ خوں چکاں باب ہے جس کو پڑھتے ہوئے جگر خون ہونے لگتا ہے۔

یہ جوے خوں خاص طور پر اس وقت اور رواں ہو جاتی ہے جب اس دور کے ممتاز اہلِ قلم اور نام ور علماے دین کی بے کسی، بے بسی اور تباہ حالی کی داستانیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

☆ نائب مدیر ماہ نامہ قومی زبان، انجمن ترقئ اردو پاکستان، کراچی

پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک دہلی میں بیسیوں باکمال شاعر جمع ہو گئے تھے۔ ان میں شیخ امام بخش صہبائی، شیخ ابراہیم ذوق، منشی صدرالدین آزردہ، اسد اللہ خاں غالب، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، حکیم آغا جان عیش جیسے کہنہ مشق شاعر بھی تھے اور آزاد، حالی، داغ، قادر بخش صابر، شہاب الدین ثاقب، سالک، مجروح، مرزا انور اور باقر علی کامل وغیرہ جیسے نوعمر بھی۔ بقول صاحبِ گلِ رعنا جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی رشک آتا ہوگا۔(۲)

بہادر شاہ ظفر خود صاحبِ دیوان شاعر تھے انھیں پہلے ہی سلطنتِ مغلیہ کے انجام اور اپنی بے بسی کا اندازہ ہو گیا تھا اسی لیے انھوں نے ۱۸۵۲ء کے ایک مشاعرے میں فرمایا تھا۔

شاہوں کے مقبرے سے الگ دفن کیجیو
ہم بے کسوں کو گورِ غریباں پسند ہے(۳)

یوں تو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد دہلی میں مسلمانوں کا کوئی طبقہ ایسا نہیں تھا جسے تباہی و بربادی کے اس بادِ سموم نے نہ جھلسایا ہو لیکن خاص طور پر شعرا، ادبا اور علما کی ایک کثیر تعداد کو جس طرح چُن چُن کر انتقام کا نشانہ بنایا گیا وہ ظلم، سفاکی اور خوں ریزی کی ایک ایسی داستان ہے جس کا ہر ورق لہو رنگ ہے، صرف مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب کالا پانی ہی پڑھ جایئے جو اٹھارہ سال جزائر انڈمان میں مصائب جھیلتے رہے۔(۴) علامہ فضل حق خیرآبادی جیسے باکمال عالم کو دیکھیے جو بے شمار تصانیف کے خالق بھی ہیں اور جن کے عربی قصائد شمار میں سو سے زائد ہیں وہ کس طرح جزائر انڈمان میں مصائب و آلام برداشت کرتے کرتے راہیٔ ملکِ عدم ہوئے،(۵) اسد اللہ خاں غالب کی آپ بیتی پڑھیے جن کی مشکلات اور فاقہ کشی کی داستانیں اہلِ درد کو تڑپاتی ہیں(۶) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی داستانِ حیات کے اوراق پر نظر ڈالیے جو تذکرۂ گلشنِ بے خار کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی اور اردو کے باکمال شاعر تھے لیکن سات برس تک قیدِ فرنگ میں رہے۔(۷) مفتی صدرالدین آزردہ جیسے عالم اور شاعر کے عالمِ پیری کی بپتا سنیے جنھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام کس مپرسی میں گزارے، قید کی ذلت بھی برداشت کی، ملازمت بھی موقوف ہوئی اور مال و جائیداد سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔(۸)

غلام شبیر رانا لکھتے ہیں:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمان اہلِ قلم پر قیامت ٹوٹ پڑی، سید سجاد حیدر یلدرم

کے دادا امیر احمد علی نے جنگِ آزادی میں حصہ لیا انھیں تمام جاگیروں سے محروم کر دیا گیا اس کے نتیجے میں پورا خاندان معاشی بدحالی کا شکار ہو گیا۔ محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر کو سزائے موت دی گئی۔ ظفر علی خاں اور مولانا حسرت موہانی کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔(۹)

جنگِ آزادی کے بعد انگریز سرکار کے عتاب کا نشانہ بننے والوں میں مولانا امام بخش صہبائی جیسے عالمِ بے بدل کا نام بھی سرِفہرست ہے جو فارسی زبان کے عالم، قادرالکلام شاعر، ماہرِ عروض، صاحبِ طرز انشا پرداز، نکتہ بیں محقق اور شارح کی حیثیت سے دہلی میں انتہائی ممتاز مقام رکھتے تھے اور جنھیں جمنا کنارے قتل کر دیا گیا تھا لیکن قبل اس کے کہ ان کے قتل کے واقعے کا ذکر کیا جائے بہتر ہوگا کہ ان کی علمی کاوشوں کا بھی ایک اجمالی جائزہ لیا جائے۔

مولانا محمد بخش تھانیسری مولانا صہبائی کے والد تھے جنھوں نے تھانیسر سے دہلی آ کر کوچۂ چیلاں میں گھر بنالیا تھا۔ مغل بادشاہ شاہ جہاں کے زمانے میں بلا تفریقِ مذہب و ملت مختلف پیشہ وروں اور علوم وفنون سے وابستہ افراد کے لیے الگ الگ کوچے اور محلے تعمیر کیے گئے۔ انھی میں ایک مشہور جگہ کوچۂ چیلاں جامع مسجد کے قریب آباد تھی جس میں علما اور صلحا رہتے تھے۔ ناصر نذیر فراق نے لکھا ہے کہ ''جب لال قلعہ اور جامع مسجد بن کر تیار ہو گئے تو شاہ جہاں نے حکم دیا کہ امرا اور رؤسا کی کی حویلیاں شہر کے بیچوں بیچ اور کاریگروں اور صنعت کاروں کے کوچے کنارے کنارے بسائے جائیں۔(۱۰)

جسٹس حاذق الخیری علامہ راشد الخیری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بچپن کوچۂ چیلاں میں گزرا۔ سنا ہے پہلے یہ کوچۂ چہل امیران کہلاتا تھا۔ دلّی کے کرخنداروں کو(۱۱) یہ نام ناگوارِ خاطر گزرا چناں چہ بگڑتے بگڑتے کوچۂ چیلاں ہو گیا۔(۱۲)

کئی اہم علمی و ادبی شخصیات یہاں قیام پذیر تھیں جن کی وجہ سے یہ کوچہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ بعد میں عصمت، کامریڈ اور ہمدرد کے دفاتر بھی یہیں قائم ہوئے تھے۔(۱۳) مومن خاں مومن کی پیدائش بھی ۱۸۰۱ء میں کوچۂ چیلاں میں ہی ہوئی تھی۔ مولانا امام بخش صہبائی دلّی کے اسی مشہور محلے کوچۂ چیلاں کے رہنے والے تھے آپ کی پیدائش بھی یہیں ہوئی۔ مالک رام نے صہبائی کا سنہِ پیدائش ۱۲۲۱ھ اور سنہِ وفات ۱۲۷۳ھ بتایا ہے(۱۴) جب کہ انتخابِ دواوین میں آپ کا سنہِ وفات ۱۲۷۴ھ درج ہے۔ لیکن اس سلسلے میں زیادہ تر روایتیں ۱۲۷۳ھ کی ملتی ہیں اس طرح عیسوی تقویم کے مطابق آپ کی پیدائش ۱۸۰۶-۰۷ء میں اور شہادت ۱۸۵۷ء میں ہوئی۔ اُن کا شجرۂ نسب والد کی طرف سے حضرت عمر فاروقؓ اور والدہ کی طرف سے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے جا ملتا ہے۔(۱۵) مولانا صہبائی

کے حالاتِ زندگی سے زیادہ تفصیل کے ساتھ آگاہی نہیں ہوسکی۔ اُن کا ذکر اور اُن کا تعارف تو کئی کتابوں میں موجود ہے لیکن بے حد اختصار کے ساتھ۔ گویا اب تک مولانا امام بخش صہبائی پر کوئی ایسا تحقیقی کام نہیں ہوا جس کے وہ مستحق ہیں۔ اُن کے حالاتِ زندگی کی عدم دستیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انھیں اٹھارہ سو ستاون کے فوراً بعد قتل کر دیا گیا تھا اور دلی میں ایسی قتل و غارت ہوئی تھی کہ شہر خالی ہو گیا تھا مولانا صہبائی کا گھر ہی نہیں بلکہ پورا محلّہ برباد ہوا۔ ایسے میں ان کے حالاتِ زندگی کا تفصیل کے ساتھ دستیاب ہونا مشکل ہے۔ مولانا حامد حسن قادری صہبائی کے تعارف میں لکھتے ہیں:

> دہلی کے رہنے والے، فارسی کے بڑے عالم و محقق تھے، فارسی کی نہایت ادق کتبِ درسیہ سہ نثر ظہوری وغیرہ کی شرحیں بڑی تحقیق کے ساتھ فارسی میں لکھی ہیں۔ غدر سے پہلے دہلی کالج میں پروفیسر تھے جہاں مولوی محمد حسین آزاد، ماسٹر پیارے لال آشوب وغیرہ ان کے شاگرد تھے۔(۱۶)

مولانا امام بخش صہبائی نے عبداللہ خاں علوی سے فارسی و عربی علوم میں تعلیم حاصل کی تھی۔ انھی کے فیضانِ صحبت کا نتیجہ تھا کہ صہبائی فارسی نظم و نثر میں زبردست استعداد کے مالک ہوئے اور بہت جلد ان کے تبحر علمی کی دھوم مچ گئی۔ غالب نے اپنے معاصرین میں صہبائی کو بھی یاد کیا ہے:

> ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود   باد در خلوتِ شاں، عطر فشاں از دمِ شاں
> وحشت و نیّر و صہبائی و علوی وانگاہ   حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں(۱۷)

حالی نے یادگارِ غالب میں لکھا ہے کہ ''صہبائی کی نظم و نثر اور دیگر رسائل اور شروح تین جلدوں میں چھپ کر شائع ہوچکی ہیں۔(۱۸)

مولوی عبدالحق نے ذکر کیا ہے کہ ان کی کتابیں نصابِ تعلیم میں داخل تھیں۔(۱۹) مرزا غالب سے صہبائی کے دوستانہ روابط تھے۔ البتہ جب صہبائی کے ایک شاگرد مرزا رحیم بیگ نے قاطع برہان کی مخالفت میں ساطع برہان شائع کی تو غالب نے اُن کے ساتھ ساتھ صہبائی پر بھی طنز کے تیر چلائے۔(۲۰)

کلیاتِ صہبائی کے علاوہ صہبائی نے شرح سہ نثر ظہوری لکھی اور ایک رسالہ معما معموں کے حل کے ضمن میں لکھا اسی نسبت سے وہ معمائی بھی کہلائے تاہم اُن کی زیادہ مشہور تصانیف میں ترجمہ حدائق البلاغت، قواعدِ اردو، صرف و نحو اور انتخابِ دواوین شامل ہیں۔

نام ور مستشرق گارساں دتاسی نے صہبائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''یہ قابل مصنف دہلی میں فارسی کے سب سے زیادہ فاضل ادیب تصور کیے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے دہلی کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر کیے گئے... قابلِ ذکر

کتابیں صہبائی کی تصانیف ہیں جن کے نام یہ ہیں؛ حدائق البلاغت، انتخاباتِ نظم اور قواعدِ اردو۔ ان کی قواعدِ اردو اس وجہ سے اور بھی زیادہ قابلِ قدر ہے کہ اس کے آخر میں ضرب الامثال اور محاورات کی فہرست درج ہے۔''(۲۱)

قواعدِ اردو کے علاوہ مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ حدائق البلاغت کا اردو ترجمہ ہے۔ حدائق البلاغت دراصل میر شمس الدین فقیر دہلوی کی تصنیف ہے جس میں علمِ بیان، علمِ بدیع اور علمِ عروض پر تفصیلی اظہارِ خیال کیا گیا ہے لیکن صہبائی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو بنیاد بنا کر اور تنقید و تجزیے کی راہ اختیار کرتے ہوئے اسے طبع زاد بنا دیا ہے۔ جس طرح شمس الدین فقیر نے رودکی سے لے کر شیرازی تک فارسی شعرا سے استفادہ کیا ہے اسی طرح صہبائی نے متن کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کے بجائے اپنے عہد کے مروجہ اسلوب کو اختیار کرتے ہوئے اردو شعرا بطور خاص میر، سودا اور ذوق کے اشعار سے اپنے مؤقف کی وضاحت کی ہے۔(۲۲)

مولانا حامد حسن قادری نے بھی اس کتاب کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے ''صرف کہنے کو ترجمہ ہے ورنہ اصل میں فنِ بلاغت کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ اردو میں اس فن کی پہلی مکمل و مستند کتاب ہے۔''(۲۳) اس کتاب کا ترجمہ مولانا صہبائی نے ۱۸۴۲ء میں کیا اور منشی نول کشور نے اسے صہبائی کی وفات کے بعد اسے کانپور سے ۱۸۸۷ء میں شائع کیا۔ انشا کی دریائے لطافت کے بعد یہ اردو میں اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ مولانا صہبائی نے اپنے مختصر دیباچے میں بیان کیا ہے کہ پرنسپل مدارس شاہ جہان آباد، فیلکس بطرو (Felix Botrous) نے ان کی توجہ اس طرف دلائی جنھوں نے صہبائی کو مدرس اول کے درجے پر ترقی دی تھی، جس کے بعد انھوں نے حدائق البلاغت کا ترجمہ شروع کیا۔ واضح رہے کہ مولانا امام بخش صہبائی ۱۸۴۰ء میں دہلی کالج میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے تھے۔ ان کے تقرر کا دل چسپ واقعہ مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب مرحوم دہلی کالج میں درج کیا ہے(۲۴) واضح ہو کہ حدائق البلاغت کے نام سے ایک اور کتاب ۱۹۵۴ء میں بھی شائع ہوئی جس پر درج ہے۔ مترجم خدیجہ شجاعت علی، فاضل ترجمہ نگار نے صہبائی کی خدمت کا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ ''چوں کہ اس کی زبان مشکل ہے اس لیے طلبہ کے لیے اس کتاب کو سمجھنا مشکل ہے۔'' راقمہ کے نزدیک محترمہ خدیجہ صاحبہ کی مرتبہ اس کتاب کی کوئی خاص اہمیت نہیں البتہ ۲۰۰۹ء میں ڈاکٹر مزمل حسین نے تفصیلی مقدمے اور تاریخِ علمِ بلاغت کے ساتھ حدائق البلاغت کو دوبارہ اشاعت کے مرحلے سے گزارا ہے اور آخر میں اصل متن بھی شامل کر دیا ہے۔

صہبائی کے مرتبہ انتخابِ دواوین کو بھی شہرت حاصل ہوئی جس میں صہبائی نے اردو کے کچھ اہم شعرا کے کلام کا انتخاب کیا ہے جن میں شمس ولی اللہ (ولی دکنی)، خواجہ میر درد، سودا، میر، جرأت، میر حسن، نصیر، ممنون، ناسخ، مول چند،

ذوق اور مومن شامل ہیں۔ اردو تذکرہ نگاری کی تاریخ میں اگر چہ یہ تذکرہ بہت اہم تو نہیں لیکن اس کی ایک تاریخی اہمیت ضرور ہے جس میں مولانا امام بخش صہبائی نے ہر شاعر کے کلام سے قبل اس کا مختصر تذکرہ بھی کیا ہے۔ انتخابِ دواوین کی کمیابی کے سبب ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اسے بڑی محنت سے مرتب کیا جسے ۱۹۸۷ء میں شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی نے شائع کیا۔ یہ انتخاب طالب علمانہ ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر تیار کیا گیا تھا اس لیے اس میں شعر کی تعریف، تاریخ اور اجزائے ترکیبی کے علاوہ مختلف اصنافِ سخن کا تعارف بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے انتخابِ دواوین کے نام سے لکھے گئے پیش لفظ میں جہاں اس کی تاریخی اہمیت کا ذکر کیا ہے وہیں اس انتخاب کی کم زوریوں کا بھی جائزہ لیا ہے مثلاً اس بات پر سب سے زیادہ حیرت کا اظہار کیا ہے کہ اس میں مول چند جیسا غیر معروف شاعر تو موجود ہے لیکن غالب جیسے شاعر کے کلام کا انتخاب شامل نہیں۔[۲۵] اگر چہ انھوں نے فارسی پر اُن کی دست رس اور بیان و بلاغت اور قواعد ولغت میں ان کی دل چسپی کا ذکر کرتے ہوئے صہبائی کا تعارف مندرجہ ذیل الفاظ میں کرایا ہے:

> خان آرزو اور شیخ علی حزیں کے مابین جن مسائل پر معارضہ ہوا، اُن کے بارے میں جن لوگوں نے اس کے بعد قلم اٹھایا اُن میں صہبائی کا نام امتیازی حیثیت میں سامنے آتا ہے۔ وہ قدیم دہلی کالج کے اساتذۂ ادبیات میں سے تھے۔ دہلی کے تاریخی آثار پر سرسید نے آثار الصنادید کے نام سے جو کام کیا اس میں صہبائی کی معاونت کو بھی دخل تھا۔[۲۶]

کتابِ مذکور میں صدر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی تحریر بہ عنوان ''مولانا امام بخش صہبائی اور اُن کی تالیف: انتخابِ دواوین'' ایک مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے صہبائی کے تعارف میں مولانا ضیا احمد بدایونی اور دیگر تذکرہ نگاروں کا حوالہ دیتے ہوئے اگر چہ فارسی درسیات اور زبان و ادب پر ان کی دست گاہِ کامل کا اعتراف کیا ہے لیکن یہ رائے بھی دی ہے کہ وہ اس پائے کے محقق نہیں تھے کہ زبان و ادب کے بارے میں ان کا ہر قول قولِ فیصل ہو۔[۲۷] پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے صہبائی کی ان تصانیف کی تفصیل بھی دی ہے جن کا ذکر مسالک و منازل میں مولانا ضیا احمد بدایونی نے کیا ہے۔ یہ فہرست کچھ یوں ہے:

۱۔ کلیاتِ صہبائی (جو ان کے چودہ رسائل اور دیوان پر مشتمل ہے):

(۱) ریزۂ جواہر	(۲) فرہنگِ ریزۂ جواہر	(۳) پیامِ شوق
(۴) رسالہ نحو فارسی	(۵) کافی در علمِ قوافی	(۶) وافی شرحِ کافی
(۷) گنجینۂ رموز	(۸) جواہرِ منظوم	(۹) قطعۂ معمائی
(۱۰) مخزنِ اسرار	(۱۱) رسالۂ نادرہ	(۱۲) نتائج الافکار

(۱۳) غوامضِ سخن	(۱۴) بیاض
۲۔ شرحِ شبنم شاداب	ظہیر تغرشی
۳۔ شرحِ مقامات	نصیر ہمدانی
۴۔ شرحِ رسالۂ معمیات	۔
۵۔ شرحِ الفاظ مشکلہ	ٹیک چند بہار
۶۔ شرح حسن و عشق	نعمت خاں عالی
۷۔ شرحِ جواہر الحروف	ٹیک چند بہار
۸۔ شرحِ سہ نثر ظہوری	ملّا ظہوری
۹۔ شرحِ مینا بازار	۔
۱۰۔ شرحِ پنج رقعہ	۔
۱۱۔ قولِ فیصل	ردّ سراج الدین آرزو(۲۸)

آخری تصنیف قولِ فیصل دراصل سراج الدین خان آرزو کی کتاب تنبیہ الغافلین کے جواب میں لکھی گئی تھی جس میں آرزو نے شیخ علی حزیں کے دیوان پر اعتراضات کیے تھے۔

ظہیر احمد صدیقی نے انتخابِ دواوین کا بھرپور تنقیدی جائزہ لیا ہے اور اس کی کمزوریوں مثلاً اصنافِ شعر کا سطحی سا تعارف، شعرا کے بارے میں محض رسمی کلمات، بعض اہم اصناف مثلاً مرثیہ، معما، تضمین وغیرہ سے اغماض، قصیدے کے سلسلے میں سودا اور ذوق کا نام نہ لینا، نمونۂ کلام میں معیار بندی کا خیال نہ رکھنا اور تذکرے میں غالب جیسے شاعر کی عدم شمولیت وغیرہ کو نشانۂ تنقید بنایا ہے لیکن اس کے باوجود انیسویں صدی کے علم و ادب کی کہانی کو صہبائی کے بغیر نامکمل قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ:

> صہبائی کے اس تذکرے یا انتخاب کو اردو تذکروں کے طویل سلسلے میں ایک قابلِ قدر اضافہ تو قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن ان کے اپنے مذاق اور معیاروں کے مطالعے کے ضمن میں اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں اور یہ امر تو بہر حال مسلّم ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول کی دلی کی علمی و ادبی شخصیتوں میں ان کا مقام مسلّم ہے اور یہ مجموعہ اگرچہ ان کے کمالاتِ علمی کی پوری نمائندگی نہیں کرتا لیکن اس عہد کے علمی و ادبی معیاروں کے مطالعے کے لیے ایک کارآمد دستاویز ضرور ہے۔(۲۹)

سلطان محمود حسین نے صہبائی کی تصنیف انتخابِ نظم کا تذکرہ اس طرح کیا ہے ''اصل نام انتخابِ شعراے ہند، دہلی، ۱۸۵۰ء، مرتبہ: صہبائی۔ لیکن قواعدِ اردو کی سرخی کے تحت وہ لکھتے ہیں کہ ''یہ صہبائی کی تصنیف نہیں ہے بلکہ مولوی امام بخش کی ہے جو دہلی کالج میں ہی مدرس تھے'' یقیناً فاضل مصنف سے لکھنے میں سہو ہوا ہے کیوں کہ مولوی امام بخش صہبائی کا ہی نام تھا اور وہ دہلی کالج میں فارسی کے استاد بھی تھے۔ (۳۰)

صہبائی کے ایک شاگرد مرزا قادر بخش صابر تھے جن کا تذکرہ گلستانِ سخن کے نام سے مشہور ہوا جسے بعض ناقدین نے صابر کے بجائے ان کے استاد صہبائی کی تالیف قرار دیا ہے۔ ظہیر احمد صدیقی نے قدیم دلی کالج نمبر (مرتبہ: پروفیسر خواجہ احمد فاروقی) کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ مرزا قادر بخش صابر کی تذکرۂ گلستانِ سخن کو غالب نے صہبائی کی تصنیف بتایا ہے (۳۱) جب کہ مشہور تذکرے خمخانۂ جاوید میں بھی گلستانِ سخن کو مولانا صہبائی کی تدوین قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ مرزا قادر بخش صابر نے اسے اپنے نام سے چھپوایا۔ (۳۲)

سرسید احمد خاں کی معرکہ آرا تصنیف آثار الصنادید کے حوالے سے بھی مولانا امام بخش صہبائی کا ذکر بہت آتا ہے۔ آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن مطبع نول کشور سے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں سرسید نے صہبائی سے مدد لی تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان عبارتوں پر فارسی اسلوب کا بہت اثر تھا۔ جب اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوا تو سرسید نے اس کی زبان کو صاف اور رواں کرنے کی طرف توجہ دی۔ سرسید نے تذکرۂ اہلِ دہلی والے باب میں ان کا بڑی محبت سے ذکر بھی کیا ہے۔ سرسید مولوی صہبائی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> فنونِ متعارفہ سخنوری مثلِ تحقیق لغت و اصطلاحات، زبان داری اور تدقیقِ مقاماتِ کتابی اور تکمیلِ عروض و قافیہ و استکمالِ فنِ معما وغیرہا میں ایسا کمال بہم پہنچایا ہے کہ ہر فن میں یک فنی کہنا چاہیے۔ (۳۳)

آثار الصنادید پر جو فارسی تقریظ مولوی امام بخش صہبائی نے لکھی ہے اس میں ان کی فارسی مثنوی کے بھی چند اشعار شامل ہیں جن میں سے دو درج ذیل ہیں:

تا حرفی ازیں کتاب خیزد دل خون شود بخاک ریزد
تا یک رقمش بخوں نگارند ہر صفحۂ دل جنوں نگارند (۳۴)

مولوی امام بخش صہبائی فارسی اور اردو کے بہت اچھے شاعر تھے۔ بقول حامد حسن قادری شاہی قلعۂ معلّٰی سے بھی صہبائی کی رسم و راہ تھی۔ شاہی خاندان کے بعض افراد ان کے شاگرد تھے۔ شعر و سخن میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ (۳۵)

مفتی انتظام اللہ شہابی نے لکھا ہے کہ اردو میں تو گنتی کے ہی اشعار کہے ہوں گے البتہ وہ فارسی کے با کمال شاعر تھے۔[۳۶] ۲۵؍فروری ۱۸۴۵ءکو محل 'حیات بخش' میں ہونے والے ایک مشاعرے کی تفصیلی روداد سے پتا چلتا ہے کہ اس میں شاہی خاندان کے شعرا کے علاوہ غالب سمیت دہلی کے مشاہیر شعرا موجود تھے۔اس مشاعرے میں مولانا امام بخش صہبائی نے جوطرحی غزل سنائی اس کا مطلع اور مقطع پیش خدمت ہے:

چہ گل کہ در کفِ پا نشگفد زخار مرا   جنوں بفصلِ خزاں میکند بہار مرا
فلک بماتمِ یارانِ رفتہ صہبائی   سر و دماغ و دل وچشم اشک بار مرا[۳۷]

مثنوی دمغ الباطل کے بارے میں ایک خیال یہ ہے کہ یہ غالب کی تخلیق ہے لیکن یہ مثنوی صہبائی کی تصنیف ہے۔[۳۸] حالی نے یادگارِ غالب میں غالب کی فارسی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے صہبائی کا بھی ذکر کیا ہے جس سے مولانا صہبائی کی فارسی شاعری پر دست رس کا اندازہ ہوتا ہے۔

حالی لکھتے ہیں:

> مرزا نے جس وقت شعرِ فارسی کے میدان میں قدم رکھا تھا اس وقت ہندوستان میں دو طرزوں کا زیادہ رواج تھا، ایک نظیری وعرفی وغیرہ کی طرز جو اکبر کے زمانے سے چلی آتی تھی دوسری مرزا بیدل کی طرز جو عالم گیر کے عہد میں شائع ہوئی اور علوی اور صہبائی پر آ کر ختم ہوگئی۔[۳۹]

غالب اور صہبائی کے تعلقات کا جائزہ لیا جائے تو بظاہر تو ایسا نظر آتا ہے کہ ابتدا میں غالب اور صہبائی کے تعلقات دوستانہ تھے۔مفتی صدرالدین آزردہ کے گھر پر جوعلمی وشعری محافل منعقد ہوتی تھیں ان میں یہ دونوں شریک ہوتے تھے۔ غالب نے فارسی قطعے میں اپنے جن معاصرین کا ذکر محبت سے کیا ہے ان میں صہبائی کا نام بھی ہے۔ سعدالدین شفق کے نام غالب کا لکھا ہوا ایک خط جو عودِ ہندی میں شامل ہے اس میں غالب نے لکھا ہے کہ صہبائی کے ایک تذکرے کی جلد میری مِلک میں سے میرے پاس تھی وہ اپنی طرف سے بسبیلِ ارمغاں بھیجتا ہوں۔ نذرقبول ہو۔"[۴۰] باوجوداس کے کہ یہ تذکرہ غالب کے ذکر سے محروم ہے، غالب اس کا ذکر اچھی طرح کرتے ہیں۔ غالب اور صہبائی شاہی دربار کے مشاعروں میں بھی ایک ساتھ شریک ہوتے رہے پھر ایسا کیا ہوا کہ صہبائی کے شاگرد مرزا رحیم بخش کی ساطع برہان پر جب غالب ناراض ہوئے تو خود صہبائی کے بارے میں یہ کہہ اٹھے:

> وائے اس ہیچ پوچ پرجس کوصہبائی کا تلمذ موجبِ عزووقار ہو۔[۴۱]

عودِ ہندی کے ایک اور خط میں غالب کا لہجہ اس سے بھی زیادہ تند وتیز ہے۔سب سے زیادہ حیرت اس بات

پر ہوتی ہے کہ صہبائی کے سفاکانہ قتل کا واقعہ اتنا معمولی نہیں تھا کہ غالب اس کا ذکر نہ کرتے لیکن خطوطِ غالب یا دستنبو کہیں بھی صہبائی کی شہادت پر غالب کا تبصرہ نظر نہیں آتا۔ دستنبو میں تو خیر غالب کی مصلحت پسندی صاف آشکار ہے۔ خلیق نظامی لکھتے ہیں:

> غالب کے دستنبو میں ذہنی مرعوبیت اور خوشامد کا پہلو غالب ہے۔ گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سکہ کے اشعار لکھنے اور دربارِ بہادر شاہی میں حاضری کا داغ دھونے کی خواہش اس کی محرک ہے۔ ان کے خطوط میں ہنگامے سے متعلق حقیقی جذبات ملتے ہیں اور بعض میں یقیناً سوزِ دل کی بو آتی ہے لیکن دستنبو میں وہ انگریز کی زبان سے بولے ہیں اور مصلحت کے قلم سے انھوں نے لکھا ہے۔[۴۲]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے دستنبو میں اس کا ذکر مصلحتاً نہیں کیا لیکن خطوطِ غالب میں بھی اس کا ذکر نہیں لہٰذا گمان ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان کسی بات پر رنجش ضرور ہوئی تھی۔ سونے پر سہاگا صہبائی انگریز سرکار کے معتوب بھی ٹھہرے۔ شاید اسی لیے غالب نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ اُن کے تذکرے سے گریز کیا جائے۔

دہلی میں جنگ آزادی کے بعد انگریز سپاہیوں، سکھوں اور ڈوگروں کو مسلمانوں کے قتلِ عام کا کھلا پروانہ مل گیا تھا۔ جو مسلمان یہ ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتے تھے کہ انھوں نے کمپنی بہادر کی حمایت کے لیے کیا کیا، وہ عتاب کا نشانہ بن جاتے تھے۔ عام طور پر گروہوں کی صورت میں مسلمان شرفا کو گھیر کر لایا جاتا تھا اور فیصلہ سنا دیا جاتا تھا سید ہاشمی فرید آبادی نے قیصرالتواریخ (جلد ۲۔ص ۴۵۴) کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ عدلِ فرنگی کے یہ فیصلے عموماً جمنا کنارے عمل میں لائے جاتے تھے اور دریا میں روزانہ لا تعداد لاشیں بہتیں اور مچھلیوں کی خوراک بن جاتی تھیں قیصرالتواریخ میں دہلی کے ان کشتگانِ فرنگ کا تخمینہ ۲۷ ہزار لگایا گیا ہے۔[۴۳]

اس ضمن میں عارف حسین مصباحی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ''مسلمانوں کو یا تو گولیوں سے اڑا دیا جاتا تھا یا درختوں پر پھانسیاں آویزاں کر کے انھیں لٹکا دیا جاتا تھا۔ انگریز فوجی افسر ہنری کوئن (Henry Quin) لکھتا ہے 'دہلی دروازے سے پشاور تک گرینڈ ٹرنک روڈ کے دونوں ہی جانب شاید ہی کوئی خوش قسمت درخت ہوگا جس پر انقلاب ۱۸۵۷ء کے ردِعمل اور اسے کچلنے کے لیے ہم نے ایک یا دو عالمِ دین کو پھانسی پر نہ لٹکایا ہو۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً بائیس ہزار علمائے کرام کو پھانسی دی گئی۔'،''[۴۴]

اسی مضمون میں مصنف کے بقول مولانا حسین احمد مدنی نے لکھا ہے کہ مسلمان علما میں سے مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، دلاور جنگ مدراسی، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا امام بخش صہبائی اور اُن حضرات کے تلامذہ نے جہادِ حریت ۱۸۵۷ء

میں بڑے پیمانے پر حصہ لیا۔[۴۵]

یقیناً اس میں اور کئی علما کے نام شامل کیے جاسکتے ہیں لیکن اس بات کے بھی زیادہ شواہد نہیں ملتے کہ صہبائی نے عملی طور پر جہادِ حریت میں کس طرح حصہ لیا تھا۔ کچھ جگہوں پر ان کے بےقصور مارے جانے کا ذکر بھی ہے۔

مولانا حامد حسن قادری داستانِ تاریخ اردو میں لکھتے ہیں:

> غدر ۱۸۵۷ء/ ۱۲۷۳ھ کے سلسلے میں جن لوگوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے اُن میں صہبائی کا حصہ بھی کسی سے کم نہ رہا یعنی قتل کیے گئے اور ان کا مکان کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔[۴۶]

جن خاندانوں کے افراد نے اگر لڑائی میں کچھ بھی حصہ لیا تھا اور انگریزوں کے خلاف کوئی ہلکی سی کارروائی بھی کی تو ان کی حویلیاں اور گھر کھدوا دیے گئے، اُن کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں، انھیں پھانسیوں پر لٹکا دیا گیا۔[۴۷] اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ صہبائی نے انگریزوں کے خلاف تحریک میں کچھ نہ کچھ حصہ لیا تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن نے لکھا ہے کہ ''۱۸۴۰ء کی دہائی میں دلّی کالج کے شعبۂ فارسی کے سربراہ مولوی امام بخش صہبائی کے ایک شاگرد مولوی رحمت اللہ کیرانوی نے فنڈر کے خلاف اپنے تیر چلائے۔''[۴۸] واضح رہے کہ فنڈر (Karl Gottlieb Pfander) ایک جرمن پادری تھا جس نے مشنری تحریک کے فروغ کے لیے کام کیا۔

افضل حق قرشی نے اپنی مرتب کردہ کتاب مولانا فضل حق خیرآبادی میں لکھا ہے کہ:

> صہبائی دہلی کالج کے استاد تھے اور مولوی محمد باقر دہلی کالج کے انگریز پرنسپل ٹیلر سے نہایت دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ دونوں نے جنگِ آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ لیکن دونوں کو محض اس لیے گولی مار دی گئی کہ وہ اپنے گھروں میں چھپے ہوئے انگریز پناہ گزینوں کی جانیں نہ بچا سکے تھے۔[۴۹]

لیکن اس سلسلے میں کچھ اور روایتیں بھی ملتی ہیں مثلاً یٰسین اختر مصباحی نے اپنی کتاب چند ممتاز علماے انقلاب ۱۸۵۷ء میں لکھا ہے کہ:

> مولانا امام بخش صہبائی انگریز مخالف ذہن اور مجاہدین کے ساتھ ہم دردی رکھتے تھے۔ قلعۂ معلیٰ کی مجلسِ شوریٰ اور بعض مشوروں اور سرگرمیوں میں شریک ہوکر انگریزی اقتدار کے خاتمے کے آرزومند اور کوشاں بھی تھے مگر ان کی گرفتاری اور شہادت اچانک اس طرح ہوئی کہ کوچۂ چیلاں، دہلی کے کسی گھر میں ایک انگریز داخل ہوا اور بُرے ارادے

سے زنان خانے کی طرف جانے کی کوشش کی، اس حرکت پر مشتعل ہوکر کسی نے اسے زخمی کردیا۔ اس کی خبر جب انگریزی کمان افسر کو ملی تو اس نے حکم دیا کہ اس محلّے کے تمام مردوں کو قتل کردیا جائے یا گرفتار کرکے لایا جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں بہت سے مرد اسی محلّے اور گھر میں قتل کردیے گئے اور باقی ماندہ افراد کو گرفتار کرکے جمنا کے کنارے لے جاکر گولیوں سے بھون دیا گیا۔ انھیں گرفتار شدگان میں مولانا امام بخش صہبائی اور مشہورِ روزگار خوش نویس سیّد محمد امیر عرف میر پنجہ کش تھے۔ (۵۰)

لیکن انھی صفحات پر مصنف نے مشہور تصنیف غدر کی صبح و شام کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ ''ساٹھ ہتھیار بند جن میں امام بخش صہبائی اور اُن کے صاحب زادے بھی شامل تھے جو اسلامی کالج سے متعلق تھے، باغی سمجھ کر قتل کردیے گئے۔'' (۵۱)

گویا اس قتل کی وجوہات کے حوالے سے متضاد آرا ملتی ہیں لیکن مفتی صدر الدین آزردہ سمیت کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ 'صہبائی بے قصور مارے گئے' اہمیت رکھتا ہے، اس لیے کسی انگریز کے کوچۂ چیلاں کے کسی گھر میں داخل ہونے اور زخمی ہوجانے کا واقعہ ہی زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کیوں کہ صرف امام بخش صہبائی کے گھرانے پر ہی نہیں بلکہ کوچۂ چیلاں کے تمام مردوں پر یہ آفت آئی تھی۔

کوچۂ چیلاں ایک تاریخی محلہ تھا، صہبائی وہیں رہتے تھے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ ''انگریزوں کے غلبے کے بعد اس کوچے پر جو مصیبت نازل ہوئی، صہبائی بھی اس کی زد میں آئے اور اس کوچے کے دوسرے باشندوں کی طرح بالکل بے گناہ و بے قصور قتل کر دیے گئے۔ ان کے ساتھ اُن کے بیٹے عبدالکریم سوز بھی ہلاک ہوئے۔ خواجہ حسن نظامی کا بیان ہے کہ اس قتلِ عام میں صہبائی کے کنبے کے اکیس (۲۱) افراد قتل ہوئے۔'' (۵۲)

ظہیر دہلوی نے اپنی کتاب داستانِ غدر میں لکھا ہے کہ:

مولانا امام بخش صہبائی اور اُن کے دو بیٹے اور میر نیاز علی قصہ خواں اور چیلوں کے کوچے کے اور بہت سے شریف خاندانی لوگ... سنا ہے کہ اس محلے میں چودہ سو آدمی گرفتار کر کے راج گھاٹ کے دروازے سے دریا پر لے جائے گئے اور اُنھیں بندوقوں کی باڑھیں ماردی گئیں اور لاشیں دریا میں پھنکوا دی گئیں۔ عورتوں کا یہ حال ہوا کہ گھروں میں سے نکل کر بچوں سمیت کنویں میں جا گریں۔ چیلوں کے کوچے کے تمام کنویں لاشوں سے پٹ گئے تھے۔ (۵۳)

مولانا اختر امام عادل نے لکھا ہے کہ ''پورے محلے کے (کوچۂ چیلاں) تمام مردوں کو قتل کر دیا گیا یا گرفتار کر کے حاکم کے حکم سے دریا کے کنارے ان کو گولیوں سے بھون دیا گیا۔ مولانا صہبائی انھی گرفتار شدہ شہیدوں میں سے ہیں جن کا خون دریا کی ریت میں جذب ہو گیا اور ان کے خاندان کے اکیس افراد اس دن شہید کیے گئے۔''(۵۴)

غلام رسول مہر نے بھی اس واقعے کو پیش کیا ہے اور اُن کے بقول ''سقوطِ دہلی کے بعد امام بخش صہبائی، مولوی محمد باقر اور مشہور خطاط سید احمد میاں کو جمنا کے کنارے ہزاروں ہم وطنوں کے ساتھ قتل کیا گیا۔''(۵۵)

علامہ راشد الخیری کی کتاب دہلی کی آخری بہار میں مصنف نے مولانا صہبائی کے بھانجے مولانا قادر علی کا بیان درج کیا ہے کہ:

> میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائی کے ساتھ کٹرہ مہر پرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دَن دَن کرتے آ پہنچے، پہلی رکعت تھی کہ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔ شہر کی حالت نہایت خطرناک تھی اور دلّی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی، ہماری بابت مخبروں نے بغاوت کی اطلاعات سرکار میں دے دی تھیں، اس لیے ہم سب گرفتار کر کے دریا کے کنارے پر لائے گئے۔ ابھی غدر کو ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا، پھانسیوں کے بجائے باغی گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے۔ مسلح سپاہیوں نے اپنی بندوقیں تیار کیں، ہم تیس چالیس آدمی اُن کے سامنے کھڑے تھے کہ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آ کر کہا کہ موت تمھارے سر پر ہے، گولیاں تمھارے سامنے ہیں اور دریا تمھاری پُشت پر ہے، تم میں جو لوگ تیرنا جانتے ہیں، وہ دریا میں کود پڑیں۔ میں بہت اچھا تیراک تھا مگر ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائی اور اُن کے صاحب زادے مولانا سوز تیرنا نہیں جانتے تھے اس لیے دل نے گوارا نہیں کیا کہ ان کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا، اس لیے دریا میں کود پڑا۔ پچاس ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کانوں میں آئیں اور صف بستہ لوگ گر کر مر گئے۔(۵۶)

صہبائی کی شہادت پر مفتی صدر الدین خاں آزردہ نے فغانِ دہلی کے عنوان سے ایک نظم لکھی جو پانچ مسدس بند پر مشتمل ہے، اُس کا آخری بند ملاحظہ ہو:

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے	سر ہے اور جوشِ جنوں، سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر، جی ہی پہ بن جاتی ہے	مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیوں کہ آزردہ نکل جائے، نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو[۵۷]

حالی نے لکھا:

غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق — اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز[۵۸]

اکبرالہ آبادی کہتے ہیں:

نوجوانوں کو ہوئیں پھانسیاں بے جرم وقصور — ماردیں گولیاں پایا جسے کچھ زور آور
وہی صہبائی جو تھے صاحبِ قولِ فیصل — ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر[۵۹]

مشیرالحسن نے لکھا ہے کہ ''امام بخش صہبائی کوجنھوں نے سمیع اللہ خاں کوخطاطی سکھائی تھی، گولی ماردی گئی۔ اُن کے دونوں بیٹے بھی نہیں بچ پائے، اُن کی علمیت کی تعریف مولوی نذیر احمد نے بھی کی تھی اورمولوی ذکاء اللہ نے اپنے دوست مشہور پادری اور مصنف اینڈریوز (Andrews) سے کہا تھا کہ یہ خون کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔''[۶۰]

الغرض صہبائی کی شہادت اردو اور فارسی شعروادب کا ایک الم ناک باب ہے جسے ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔

حواشی

۱۔ اسداللہ خاں غالب، دیوانِ غالب کامل، مرتبہ: کالی داس گپتا رضا، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۶ء)، اشاعتِ سوم، ص ۳۴۶

۲۔ دیکھیے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مقالہ اٹھارہ سو ستاون اور اردو شاعری، http://lib.bazmeurdu.net/، رجوع کردہ ۲۲ مئی ۲۰۱۹ء۔

۳۔ محمد حمزہ فاروقی، انقلاب اٹھارہ سو ستاون اور اردو شاعری، مشمولہ صحیفہ، لاہور، جنگِ آزادی نمبر، جنوری تا جون ۲۰۰۷ء، ص ۱۷۳

۴۔ انتظام اللہ شہابی، مشاہیرِ جنگِ آزادی، (کراچی: محمد سعید اینڈ سنز، ۱۳۷۳ھ)، ص ۱۷۷۔۱۷۸

۵۔ ایضاً، ص ۹۱

۶۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر خالد ندیم کی مرتب کردہ آپ بیتی مرزا غالب، جونشریات، لاہور کے زیرِ اہتمام ۲۰۱۹ء میں غالب کی ایک سو پچاسویں برسی کے موقعے پر شائع ہوئی۔

۷۔ ایضاً، ص ۲۱۱

۸۔ انتظام اللہ شہابی، محولۂ بالا، ص ۹۹

۹۔ غلام شبیر رانا، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے تناظر میں مشمولہ صحیفہ، لاہور، جنگِ آزادی نمبر، جنوری تا جون ۲۰۰۷ء، ص ۳۴

۱۰۔ دیکھیے سیّد ضمیر حسن دہلوی کا مقالہ، میرے زمانے کی دلی، http://lib.bazmeurdu.net/، رجوع کردہ ۲۲رمئی ۲۰۱۹ء

۱۱۔ جب انگریزوں نے دلی کو دارالخلافہ بنایا اور نئی دلی تعمیر ہونے لگی تو دیہاتوں سے بھی بہت سے نوجوان روزگار کے لیے آئے انھوں نے کارخانوں کی راہ لی۔ یہ دست کار اور کاریگر پیشہ افراد تھے۔ یہ لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے تھے اور ان کی زبان شستہ نہیں تھی۔ یہ کارخانہ داروں کو کرخنداروں بولتے تھے۔ بعد میں ان میں سے کچھ لوگوں نے کام سیکھ کر اپنے چھوٹے موٹے کارخانے قائم کر لیے اور خود بھی کرخندار کہلائے۔ یہ لوگ ایک ہی لفظ کو ایک سے زیادہ تلفظ اور لہجے کے ساتھ ادا کرتے۔ ان کی بگڑی ہوئی زبان کرخنداری کہلائی۔

۱۲۔ دیکھیے حاذق الخیری کا مقالہ دوسری جنگ عظیم،آل انڈیا ریڈیو اور بی بی سی کی بے اعتباری http://m.dunya.com.pk/index.php/special-feature/2013-06-07، رجوع کردہ ۲۴رمئی ۲۰۱۹ء

۱۳۔ رازق الخیری، سوانح عمری علامہ راشدالخیری، (کراچی: فیروزسنز، ۲۰۱۹ء)، ص ۱۳۲

۱۴۔ مالک رام، تذکرۂ ماہ و سال، (دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۱۹۹۱ء)، ص ۲۴۴

۱۵۔ سرسید احمد خاں، تذکرۂ اہلِ دہلی، تصحیح وتحشیہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، (کراچی: انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، ۱۹۵۵ء)، ص ۱۳۸

۱۶۔ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخ اردو (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۶ء)، ص ۲۱۶، اشاعتِ سوم

۱۷۔ اسد اللہ خاں غالب، کلیاتِ غالب فارسی، مرتبہ سیّد تقی عابدی، (دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، س ن)، ص ۵۱۶، جلد اوّل۔ تیسرا مصرع تنویر احمد علوی نے امام بخش صہبائی کے انتخابِ دواوین (دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، ۱۹۸۷ء) کی ابتدا میں یوں درج کیا ہے:

شیفتہ حسرتی آزردہ بود اعظم شاں (دیکھیے: ص ۵)

لیکن مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے بھی اس کا متن ''حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں'' دیا ہے۔ البتہ ان کے ہاں دوسرے مصرعے میں ''عطرفشاں'' کی بجائے ''مشک فشاں'' ہے۔ دیکھیے: کلیاتِ غالب فارسی (لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، ۱۹۶۷ء)، ص ۳۰۷، ۳۰۸، جلد سوم۔

۱۸۔ الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب، مرتبہ: خلیل الرحمٰن داؤدی، (لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۶۳ء)، ص ۳۶۷، طبع اوّل

۱۹۔ مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، (نئی دہلی: انجمن ترقیٔ اردو ہند، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۶۲، طبع اوّل

۲۰۔ خالد ندیم، آپ بیتی مرزا غالب، (لاہور: نشریات، ۲۰۱۹ء)، ص ۲۷۴

۲۱۔ بحوالہ انتظام اللہ شہابی، محولۂ بالا، ص ۵۳، ۵۴

۲۲۔ امام بخش صہبائی، حدائق البلاغت، مرتبہ ڈاکٹر مزمل حسین، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۹ء)، ص ۵۶

۲۳۔ حامد حسن قادری، محولۂ بالا، ص ۲۱۶

۲۴۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مرحوم دہلی کالج میں لکھا ہے کہ ''اُن کے تقرر کا عجیب واقعہ ہے۔ ۱۸۴۰ء میں آنریبل مسٹر ٹامسن لفٹنٹ گورنر مدرسے کے معائنے کے لیے آئے تو انھوں نے یہ تجویز کی کہ ایک مستعد فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہیے۔ مفتی صدر الدین خاں صدرالصدور نے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین شخص ہیں۔ ایک مرزا نوشہ، دوسرے حکیم مومن خاں مومن، تیسرے امام بخش صہبائی۔ لفٹنٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ بھلا یہ روگ کیوں پالنے لگے تھے، انھوں نے تو انکار کر دیا۔ مومن خاں نے یہ شرط کی کہ ۱۰۰ روپے ماہانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا انھوں نے یہ خدمت چالیس روپے ماہانہ کی قبول کر لی۔ بعد میں پچاس ہو گئے۔'' (مرحوم دہلی کالج، محولۂ بالا، ص ۱۶۳)

۲۵۔ امام بخش صہبائی، انتخابِ دواوین، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی (دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۹

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۳

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۸۔۲۹

۲۸۔ ایضاً،ص ۳۰۔۳۱

۲۹۔ ایضاً،ص ۴۶۔۴۷

۳۰۔ سلطان محمود حسین، تعلیقات خطباتِ گارساں دتاسی، (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۷۸ء)،ص ۱۵۴

۳۱۔ امام بخش صہبائی، انتخابِ دواوین، محولۂ بالا،ص ۳۱

۳۲۔ لالہ سری رام، خمخانۂ جاوید، (دہلی: مخزن پریس، ۱۹۰۸ء)،ص ۲، جلد اوّل

۳۳۔ سرسید احمد خاں، آثار الصنادید، ترتیب: حیات رضوی امروہوی، (کراچی، انجمن ترقیِ اردو، ۲۰۱۷ء)،ص ۲۰۱

۳۴۔ سرسید احمد خاں، تذکرۂ اہلِ دہلی، محولۂ بالا،ص ۱۸۲

۳۵۔ حامد حسن قادری، محولۂ بالا،ص ۲۱۸

۳۶۔ انتظام اللہ شہابی، محولۂ بالا،ص ۵۱

۳۷۔ ایضاً،ص ۶۶۔۶۷

۳۸۔ خلیل الرحمٰن داؤدی، (مرتبہ)، یادگارِ غالب، مصنّفہ الطاف حسین حالی، محولۂ بالا،ص ۱۳

۳۹۔ الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب، محولۂ بالا،ص ۵۸۳

۴۰۔ اسد اللہ خاں غالب، عودِ ہندی (کان پور: مطبع نول کشور، ۱۸۸۷ء)،ص ۴۷

۴۱۔ خالد ندیم، محولۂ بالا،ص ۲۷۴

۴۲۔ دیکھیے خلیق نظامی کا مقالہ ۱۸۵۷ء: ایک مطالعہ، https://www.urduweb.org/mehfil/threads/، رجوع کردہ ۲۸ر مئی ۲۰۱۹ء

۴۳۔ سید ہاشمی فرید آبادی، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی مشمولہ نقش، جنگ نمبر، کراچی، ۱۹۶۶ء،ص ۲۲۴

۴۴۔ دیکھیے عارف حسین مصباحی کا مضمون جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء اور مدارسِ اسلامیہ کے شاہین صفت مجاہدین کا کردار، http://hamariweb.com/articles/6442، رجوع کردہ ۲۸ر مئی ۲۰۱۹ء

۴۵۔ ایضاً

۴۶۔ حامد حسن قادری، محولۂ بالا،ص ۲۱۹

۴۷۔ دیکھیے محمد عبدالرحیم قریشی کا مضمون ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے کچھ اہم پہلو، https://www.urduweb.org/mehfil/threads/، رجوع کردہ ۲۸ر مئی ۲۰۱۹ء

۴۸۔ مشیر الحسن، دہلی کے مسلمان دانش ور (انیسویں صدی)، مترجم: مسعود الحق (نئی دہلی: انجمن ترقیِ اردو ہند، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۲۶

۴۹۔ افضل حق قرشی، مولانا فضلِ حق خیرآبادی: ایک تحقیقی مطالعہ، (لاہور: الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب، ۱۹۹۲ء)،ص ۱۶۳

۵۰۔ یٰسین اختر مصباحی، چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء (نئی دہلی: دارالقلم، ۲۰۰۷ء)،ص ۱۵۱۔۱۵۰

۵۱۔ ایضاً،ص ۱۵۱

۵۲۔ گوپی چند نارنگ، محولۂ بالا

۵۳۔ بحوالہ یٰسین اختر مصباحی، محولۂ بالا،ص ۱۵۳

۵۴۔ دیکھیے اختر امام عادل قاسمی کا مضمون ۱۸۵۷ء کا انقلابِ حریت اور علمائے اسلام، http://www.darululoom-deoband.com/urdu/articles/tmp/، رجوع کردہ ۲۸ر مئی ۲۰۱۹ء

۵۵۔ بحوالہ محمد حمزہ فاروقی، محولۂ بالا،ص ۱۷۸
۵۶۔ علامہ راشد الخیری، دلی کی آخری بہار، مرتبہ ضمیر حسن دہلوی (دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۸۷ء)،ص ۹۴۔ ۹۳
۵۷۔ ہندوستاں ہمارا، مرتبہ: جاں نثار اختر (بمبئی، ہندوستانی بک ٹرسٹ، ۱۹۷۴ء)،ص ۸۳
۵۸۔ الطاف حسین حالی، دیوانِ حالی (کان پور: نامی پریس، ۱۸۹۳ء)،ص ۸۹
۵۹۔ یٰسین اختر مصباحی، محولۂ بالا،ص ۱۵۳
۶۰۔ مشیر الحسن، محولۂ بالا،ص ۲۴۸۔ ۲۴۷

مآخذ

۱۔ اختر، جاں نثار (مرتب)، ہندوستاں ہمارا، بمبئی: ہندوستانی بک ٹرسٹ، ۱۹۷۴ء۔
۲۔ حالی، الطاف حسین، یادگارِ غالب، مرتبہ: خلیل الرحمٰن داؤدی، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۳ء، طبع اوّل۔
۳۔ ـــــــ، دیوانِ حالی، کان پور: نامی پریس، ۱۸۹۳ء۔
۴۔ حسین، سلطان محمود، تعلیقات خطباتِ گارساں دتاسی، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۷۸ء۔
۵۔ خاں، سرسید احمد، تذکرۂ اہلِ دہلی، تصحیح وتحشیہ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، کراچی: انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ۱۹۵۵ء۔
۶۔ ـــــــ، آثار الصنادید، ترتیب: حیات رضوی امروہوی، کراچی: انجمن ترقیِ اردو، ۲۰۱۷ء۔
۷۔ رازق الخیری، سوانح عمری علامہ راشدالخیری، کراچی: فیروز سنز، ۲۰۱۹ء۔
۸۔ راشد الخیری، دلی کی آخری بہار، مرتبہ ضمیر حسن دہلوی، دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۸۷ء۔
۹۔ رام، لالہ سری، خمخانۂ جاوید، دہلی: مخزن پریس، ۱۹۰۸ء، جلد اوّل۔
۱۰۔ رام، مالک، تذکرۂ ماہ و سال، دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۱۹۹۱ء۔
۱۱۔ رانا، غلام شبیر، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے تناظر میں مشمولہ صحیفہ، لاہور، جنگِ آزادی نمبر، جنوری تا جون ۲۰۰۷ء۔
۱۲۔ شہابی، انتظام اللہ، مشاہیرِ جنگِ آزادی، کراچی: محمد سعید اینڈ سنز، ۱۳۷۳ھ۔
۱۳۔ صہبائی، امام بخش، انتخابِ دواوین، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، ۱۹۸۷ء۔
۱۴۔ ـــــــ، حدائق البلاغت، مرتبہ ڈاکٹر مزمل حسین، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۹ء۔
۱۵۔ عبدالحق، مولوی، مرحوم دہلی کالج، نئی دہلی: انجمن ترقیِ اردو ہند، ۱۹۸۹ء۔
۱۶۔ غالب، اسداللہ خاں، دیوانِ غالب کامل، مرتبہ: کالی داس گپتا رضا، کراچی: انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ۱۹۹۶ء، اشاعتِ سوم۔
۱۷۔ ـــــــ، کلیاتِ غالب فارسی، مرتبہ سیّد تقی عابدی، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، س ن، جلد اوّل۔
۱۸۔ ـــــــ، کلیاتِ غالب فارسی، مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۷ء، جلد سوم۔
۱۹۔ ـــــــ، عودِ ہندی، کانپور: مطبع نول کشور، ۱۸۸۷ء۔
۲۰۔ فاروقی، محمد حمزہ، انقلاب اٹھارہ سو ستاون اور اردو شاعری، مشمولہ صحیفہ، لاہور، جنگِ آزادی نمبر، جنوری تا جون ۲۰۰۷ء۔
۲۱۔ فرید آبادی، سید ہاشمی، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی مشمولہ نقش، جنگ نمبر، کراچی، ۱۹۶۶ء۔
۲۲۔ قادری، حامد حسن، داستانِ تاریخ اردو، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۶ء، اشاعتِ سوم۔

۲۳۔ قریشی، افضل حق، مولانا فضلِ حق خیرآبادی، لاہور: الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب، ۱۹۹۲ء۔
۲۴۔ مشیرالحسن، دہلی کے مسلمان دانش ور (انیسویں صدی)، مترجم: مسعودالحق، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۲۰۰۶ء۔
۲۵۔ مصباحی، یٰسین اختر، چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء، نئی دہلی: دارالقلم، ۲۰۰۷ء۔
۲۶۔ ندیم، خالد، آپ بیتی مرزا غالب، لاہور: نشریات، ۲۰۱۹ء۔

ویب گاہیں

1. http://lib.bazmeurdu.net/
2. http://m.dunya.com.pk/index.php/special-feature/2013-06-07
3. https://www.urduweb.org/mehfil/threads/
4. http://www.darululoom-deoband.com/urdu/articles/tmp/
5. http://hamariweb.com/articles/6442